منافقانہ نیت کے ساتھ کلمہ پڑھا۔قرآن مجید کے متواتر منقول ہونے کی وجہ سے اس میں کوئی کلام کرنا ان کے بس میں نہیں تھا؛ پس انہوں نے ''سنت نبوی'' کے خلاف ذہن سازی کے ذریعے سرد جنگ برپا کی۔

اس زمانے سے لے کر مستشرقین تک اور ان مستشرقین سے متاثر لبرل مسلمانوں نے حدیث مصطفیٰ ﷺ کو ہدفِ تنقید بنانے میں بے تحاشا زور صرف کیا۔ بہت سے فریب خوردہ مسلمان بھی اس حملے میں کافروں کے ساتھ شریک ہوئے۔ مسٹر ابوریہ کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کیا دشمنی تھی؟! اس نے اس جلیل القدر صحابی کے خلاف کتاب لکھی، جسے مستشرقین نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ڈاکٹر اعظمی نے روایت کی ہے کہ ابوریہ مرض الموت میں انتہائی اضطراب اور بیقراری کے ساتھ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے خوف کا اظہار کرتا رہا۔

ہر دور میں اہل سنت علماء ومحدثین نے دین اسلام کے مصدرِ ثانی کا مؤثر علمی دفاع کیا۔ زمانہ تابعین کے بعد نبوی پیش گوئی کے مطابق جھوٹے لوگوں نے احادیث ایجاد کرنا شروع کیں تو اہل علم نے سنت نبوی کی حفاظت اور دفاع کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں سنت نبوی کی حفاظت عروج کو پہنچی۔ تمام ثقہ راوی اور جلیل القدر محدثین سنت نبوی کو بدنیت دشمنوں سے محفوظ کرنے میں لگ گئے اور انہوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اہل حق کی اس جانب پوری یکسوئی اور مکمل توجہ نے کذاب راویوں اور بدعقیدہ مصنفین کو ''تاریخ'' کے اوراق سیاہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔

ہارون الرشید کے باپ مہدی نے ایک دروغ گو شخص کو جھوٹی حدیث گھڑنے کی سزا میں قتل کرنا چاہا تو اس نے کہا: آپ مجھے قتل کر کے کیا فائدہ پائیں گے؛ میں نے چار ہزار احادیث بنا کر لوگوں میں پھیلا دی ہیں۔ اس پر مہدی نے جواب دیا: **يعيشُ لها الجهابِذَةُ** ۔ حضرت عبداللہ بن المبارکؒ کے سامنے بھی ان جھوٹی روایتوں کا ذکر ہوا تو آپ نے بھی کہا: **يعيشُ لها الجهابذةُ** [كشف الخفا ومزيل الألباس عما اشتهر من الأحاديث على ألسنة الناسِ للعجلوني] یعنی ان جھوٹی روایتوں کا پول کھولنے کے لیے ماہرین نے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں۔

سنت نبوی کی حیثیت گھٹانے میں بعض فقہی مدارس کے اہل الرائے کا بھی ہاتھ ہے۔ انہوں نے سنت نبویہ میں سے ''خبر واحد'' کی حجیت کا انکار کیا، بعض فقہاء نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر فقاہت کی شرط عائد کی، علمی وفقہی حلقوں میں تعصب کے ذریعے کمزور اقوالِ فقہاء کو صحیح احادیث پر ترجیح دینے کی روش اپنائی۔ آج کل جو بھی شبہات پیش کیے جا رہے ہیں، سب ابتدائی دور کے معتزلہ، جہمیہ، خوارج اور سبائیوں وغیرہ سے نقل شدہ ہیں۔

اصلاحِ عقیدہ

اصولِ عقائدِ سلف صالحینؒ

ڈاکٹر عارف عبدالحکیم

تمہید: جامعات سے سالانہ ہزاروں طلباء فارغ ہوتے ہیں، ان میں سے مخلص داعی چند ہی ہوتے ہیں۔ ''اخلاص فی العلم'' کا مطلب ہے: یہ عزم صمیم کہ محنت سے علم سیکھ کر اس کے مطابق عمل کرنا اور آگے تبلیغ بھی کرنا ہے۔ اس جذبے کے بغیر صرف ''پڑھ لینے'' پر اکتفا کر کے ٹاپ نمبر بھی لینے والا مخلص داعی نہیں بنتا؛ جبکہ کبھی کم نمبر لینے والا معاشرے پر بہتر اثر ڈالتا ہے۔

بعض علماء موجودہ زمانے میں طلباء کے ہاں اخلاص کے فقدان کی شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں: **العلمُ لمّا كان في الجوامعِ كان مُذكّرًا؛ ولما نقل إلى الجامعةِ صارَ العلمُ مُؤنّثًا** یعنی جامعات اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والوں کا نصب العین عام طور پر ڈگری کا حصول ہوتا ہے، وہ مقررہ وقت میں مقررہ نصابِ تعلیم پورا کر کے امتحان دیتے ہیں۔ اس لیے ان میں مطلوبہ خلوص اور جذبہ کم ہوتا ہے۔ جبکہ جامعات کے قیام سے پہلے لوگ جامع مساجد میں علماء کے پاس پڑھتے تھے، اپنا بوریا بستر لے کر علم حاصل کرنے جاتے تھے، انہیں کوئی تعلیمی ڈگری نہیں ملتی تھی۔ اس وقت طالبانِ علم میں خلوص اور جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا تھا۔

اسلافؒ حصولِ علم کا آغاز حفظِ متون سے کرتے، پھر اس کی شرح پر عبور حاصل کرتے تھے۔ شاعر کئی باتوں کا خلاصہ ایک شعر میں جمع کرتا ہے۔ اس طریقے سے مختصر الفاظ میں ایک مضمون کا احاطہ کر لیتا ہے۔

بارہویں صدی ہجری کے مجدد محمد بن عبدالوہاب تمیمیؒ کے زمانے میں عرب میں ہر جگہ شرک و بدعت اور خرافات کا دور دورہ تھا۔ اس کے خلاف لب کشائی جرم سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے بڑی جرأت و حکمت سے عقیدہ توحید و سنت کی دعوت پھیلائی؛ کیونکہ عقیدہ ہی عمل کی بنیاد ہے۔ اور اصلاحِ عقیدہ کے بغیر اصلاحِ اعمال ممکن ہے نہ مفید۔

اسلامی عقیدہ: ہر مسلمان پر دین اسلام کے چار بنیادی مسائل کا علم حاصل کرنا ضروری ہے:

{1} ''علم'' یعنی اللہ تعالیٰ، اس کے نبی کریم ﷺ اور دین اسلام کے احکام کی معرفت حاصل کرنا۔ اس فانی زندگی کے خاتمے پر اخروی زندگی کی پہلی منزل ''قبر'' ہے۔ اس میں انسان کا استقبال تین سوالوں کے ساتھ ہوتا ہے:

(۱) مَن ربُّک؟، (۲) ما دینُک؟، (۳) مَن نبیُّک؟

[1] اللہ رب العالمین کا وجود اور اس کی توحید ربوبیت' عالم انسانیت کی غالب اکثریت کے ہاں تسلیم شدہ ہے۔ منکرین وجودِ الٰہی کو سمجھانے کے لیے ''آیات کونیہ مشہودہ'' یعنی آنکھوں سے نظر آنے والی قدرتِ الٰہی کی نشانیاں پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے امام ابوحنیفہؒ نے مناظرے میں پہنچنے میں مقررہ وقت سے تأخیر کی، تو ملحد نے پابندیِ وقت میں کوتاہی پر اعتراض کیا۔ امام صاحبؒ نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا: ''میں نے دورانِ سفر ایک عجیب منظر دیکھا، جس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا، اس وجہ سے ذرا دیر ہوگئی۔ دریائے کوفہ پر ایک کشتی بغیر کسی ملاح کے ساحل پر جاکر مسافروں کو اٹھاتی تھی، پھر دوسرے کنارے پر چھوڑتی تھی۔'' ملحد نے اس نامعقول بات پر اعتراض کیا اور مذاق اڑایا، تو امام صاحبؒ نے اس جواب سے ملحد کو لاجواب کر دیا: ''اگر ایک کشتی بغیر ملاح کے یہ کام نہیں کرسکتی، تو زمین وآسمان کا سارا نظام کس طرح ایک عظیم قدرت والی ذات کے بغیر چل رہا ہے؟!''

اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝﴾ [الطور ۳۵] ''کیا وہ لوگ خود بخود بغیر کسی چیز کے پیدا ہوئے ہیں یا وہ خود ہی خالق ہیں؟'' وجودِ انسانی کے بارے میں تین امکانات ہیں:

{1} خُلِقوا مِن غیرِ شیءٍ (خود بخود پیدا ہوئے) {2} خَلقُوا أنفسَهم (انہوں نے اپنے آپ کو پیدا کیا ہے) {3} خَلقَهُم غیرُهم (کسی اور نے پیدا کیا)۔

ہر انسان جانتا ہے کہ پوری کائنات کا مربوط نظام خود بخود نہیں بن سکتا۔ معدوم کسی چیز کو پیدا کر نہیں سکتا۔ لہٰذا یہ بات ماننا پڑے گی کہ کائنات کا خالق اس کائنات سے الگ تھلگ کوئی عظیم قدرت والی ذات ہے۔

فلسفہ کی بنیاد خالص انسانی عقل پر ہے۔ فلسفیوں کے بعد متکلمین نے بھی اپنی عقل سے وجودِ الٰہی، توحیدِ الٰہی اور عدم مثلیت تک رسائی حاصل کر لی۔ ہر چیز کا وجود کسی نہ کسی سبب سے مربوط ہے۔ ایک شخص نے بوتل میں گوشت بند کر کے سڑایا اور دعویٰ کیا کہ میں نے اس میں کیڑے ''پیدا'' کیے ہیں۔ متکلم نے جواب دیا کہ آپ اس کیڑے کے وجود کا سبب بنے ہیں اور آپ کی پیدائش کا کوئی اور سبب بنا ہے۔ وہ سبب بھی کوئی مخلوق ہو، تو اس کے لیے کوئی اور مخلوق سبب چاہیے۔ اس تسلسل کو توڑنے والا کوئی ''خالق'' ضرور ہے، جو مخلوقات کی صفات سے ہٹ کر کوئی بلند و برتر ذات ہے۔ اسے ''دلیل الحدوث والامکان'' کہا جاتا ہے۔

قرآن پاک بیان کرتا ہے کہ وجودِ الٰہی کے لیے کسی بیرونی دلیل کی ضرورت نہیں۔ ﴿وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا

تُبۡصِرُوۡنَ ﴾ [الذاریات ۲۱] یہ فطری اور بدیہی چیز ہے۔"کلُّ مولودٍ یولدُ علی الفطرةِ" [متفق علیه] ﴿اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ قَالُوۡا بَلٰی﴾ [الأعراف ۱۷۲] صلبِ آدم سے تمام ارواحِ انسانی پیدا ہوئے، سب نے رب کی ربوبیت کا اقرار کیا۔ اسی اقرار پر ہر بچہ پیدا ہوتا ہے۔﴿قَالَتۡ رُسُلُهُمۡ اَفِی اللّٰهِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾[ابراھیم ۱۰] "اللہ تعالیٰ بندوں کو اپنی پہچان کرانے کے لیے اپنی ذاتِ بابرکت، افعال، اور اسماء وصفات بیان فرماتا ہے۔ متکلمین "وجود" ثابت کرنے پر سارا زور صرف کرتے ہیں؛ اہل سنت اس کے "اسماء حسنٰی اور صفاتِ کمال" ثابت کرنے پر زور دیتے ہیں۔

س: کیا وجودِ الٰہی کا عقیدہ نجات کے لیے کافی ہے؟

ج: مشرکین مکہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے علاوہ اس کی خالقیت ورازقیت بھی تسلیم کرتے تھے، معبود ہونے کا عقیدہ بھی رکھتے تھے۔ یہ سب نجات کے لیے کافی نہیں ہے، جب تک خالقیت ومالکیت کے تقاضے پورے نہ کریں۔﴿وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ﴾ [لقمان ۲۵، الزمر ۳۸] "﴿فَاِذَا رَكِبُوۡا فِی الۡفُلۡكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ﴾ [العنكبوت ٦٥] "﴿فَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَيُؤۡمِنۡ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى لَا انۡفِصَامَ لَهَا﴾ [البقرة ١٥٦] مشرکین دینِ ابراہیمی کے مطابق حج، عمرہ بھی کرتے تھے، لیکن تلبیہ میں شرک کرتے تھے: "لبیکَ اللّٰهُمَّ لبیکَ، لا شریکَ لکَ اِلَّا شریکًا هُوَ لکَ تملِکُهٗ وَمَا مَلَکَ" [مسلم ح:۲۸۷۲، سنن البیهقي الکبریٰ ح:۸۸۱۹، المعجم الأوسط ح:۷۹۱۰، الکبیر ح:۱۲۳۴۸، مستخرج أبي عوانة ح:۳۰۲٦]

س: کیا بچے کو تعلیم وتربیت نہ دی جائے تو اس کا عقیدہ درست ہو جائے گا؟

ج: انسان کی پیدائش فطرت پر ہوتی ہے۔ اگر اسے کوئی بھی عقیدہ نہ سکھایا جائے، پھر اسے حق عقیدہ دکھایا جائے تو اسے فوراً قبول کرے گا؛ لیکن غلط عقیدہ سکھانے کے لیے کافی لمبی تمہید کی ضرورت پڑتی ہے۔ موجودہ علمی دور میں بہت سے لوگ ذاتی تحقیق سے دین اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اگر انسان تعصب کو ترک کر کے حق کو قبول کرنے پر آمادہ ہو تو فطرت بڑی سہولت سے رہنمائی کرتی ہے۔

حدیثِ قدسی میں ارشادِ الٰہی ہے: "خلقتُ عبادي حنفاءَ کلَّهم فأتتهم الشیاطینُ فاجتالتهُم عَن دینِهم" [مسلم ح:۷۳۸٦] حنیف: شرک سے توحید اور گمراہی سے ہدایت کی طرف مائل ہونے والا۔